© rasailojaraid.com

تقویتہ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھیے - دونوں جگہ وہی شاہ صاحب کی زبان بولتی نظر آئیگی - شاہ صاحب نے عملاً جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ حدیث اور قرآن کی تعلیم اور اپنی شخصیت کی تاثیر سے صحیح الخیال اور صالح لوگوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کر دی، اور پھر ان کے چاروں صاحبزادوں نے، خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس حلقے کو بہت زیادہ وسیع کیا، یہاں تک کہ ہزارہا ایسے آدمی ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے جنکے اندر شاہ صاحب کے خیالات نفوذ کیے ہوئے تھے، جنکے دماغوں میں اسلام کی صحیح تصویر اتر چکی تھی، اور جو اپنے علم و فضل اور اپنی عمدہ سیرت کی وجہ سے عام لوگوں میں شاہ صاحب اور انکے حلقہ کا اثر قائم ہونے کا ذریعہ بن گئے تھے - اس چیز نے اُس تحریک کے لیے گویا زمین تیار کر دی جو بالآخر شاہ صاحب ہی کے حلقہ سے، بلکہ یوں کہیے کہ انکے گھر سے اٹھنے والی تھی -

سید صاحب اور شاہ صاحب دونوں روحاً و معنیً ایک وجود رکھتے ہیں، اور اس وجودِ متحد کو میں مستقل بالذات مجدّد نہیں سمجھتا بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں - ان حضرات کے کارنامے کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) انہوں نے عامۂ خلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچ سکے وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابۂ کرام کے دور کی یاد تازہ ہو گئی -

(۲) انہوں نے اتنے وسیع پیمانے پر، جو انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے بر سرِ تنزل ملک میں بمشکل ہی ممکن ہو سکتا تھا، جہاد کی تیاری کی، اور اس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کر دیا - پھر غایت تدبّر کے ساتھ آغازِ کار کے لیے شمالی مغربی ہندوستان کو منتخب کیا جو ظاہر ہے کہ جغرافی و سیاسی حیثیت سے اس کام کے لیے موزوں ترین خطہ ہو سکتا تھا -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر اس جہاد میں ٹھیک وہی اصولِ اخلاق اور قوانین جنگ استعمال کیے جن سے ایک دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلہ میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہوتا ہے، اور اس طرح انہوں نے صحیح معنوں میں روح اسلامی کا پھر ایک مرتبہ دنیا کے سامنے مظاہرہ کر دیا۔ ان کی جنگ ملک و مال یا قومی عصبیت، یا کسی دنیوی غرض کے لیے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی۔ انکے سامنے کوئی مقصد اسکے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظام حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشاء کے مطابق ہے۔ اس غرض کے لیے جب وہ لڑے تو حسب قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی اور پھر اتمام حجت کر کے تلوار اٹھائی۔ اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اُس مہذب قانون کی پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے۔ کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل ان سے سرزد نہیں ہوا۔ جس بستی میں داخل ہوئے مصلح کی حیثیت سے داخل ہوئے نہ کہ مفسد کی حیثیت سے۔ انکی فوج کے ساتھ نہ شراب تھی، نہ بینڈ بجتا تھا، نہ بیسواؤں کی پلٹن ہوتی تھی، نہ انکی چھاؤنی بدکاریوں کا اڈا بنتی تھی، اور نہ ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ انکی فوج کسی علاقے سے گذری ہو اور اس علاقے کے لوگ اپنے مال اور اپنی عورتوں کی عصمتیں لٹنے پر ماتم کناں ہوں۔ انکے سپاہی دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جا نماز پر ہوتے تھے۔ خدا سے ڈرنے والے آخرت کے حساب کو یاد رکھنے والے، اور ہر حال میں راستی پر قائم رہنے والے خواہ اُس پر قائم رہنے میں انکو فائدہ پہنچے یا نقصان۔ انہوں نے کہیں شکست کھائی تو بزدل ثابت نہ ہوئے، اور کہیں فتح پائی تو جبّار اور متکبر نہ پائے گئے۔

(۳) اُن کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا اُس میں انہوں نے ٹھیک اُس طرز کی حکومت قائم کی جسکو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔ وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ، وہی عدل و انصاف، وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا، وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو اور ظالم کی مخالفت اگرچہ قوی ہو، وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اخلاق صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا، غرض ہر پہلو میں انہوں نے اسی حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا جو کبھی صدیق و فاروق نے کی تھی۔

یہ لوگ بعض طبعی اسباب کی وجہ سے، جنکا ذکر آگے آتا ہے، ناکام ہوئے، مگر خیالات میں جو حرکت وہ پیدا کر گئے تھے اسکے اثرات ایک صدی سے زیادہ مدت گذر جانے کے باوجود اب تک ہندوستان میں موجود ہیں۔

اسبابِ ناکامی اس آخری مجدّدانہ تحریک کی ناکامی کے اسباب پر بحث کرنا عموماً اُن حضرات کے مذاق کے خلاف ہے جو بزرگوں کا ذکر عقیدت ہی کے ساتھ کرنا پسند کرتے ہیں۔ اسلیے مجھے اندیشہ ہے کہ جو کچھ میں اس عنوان کے تحت عرض کرونگا وہ میرے بہت سے بھائیوں کے لیے تکلیف کا موجب ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا مقصد اس تمام ذکر اذکار سے محض سابقین بالایمان کو خراجِ تحسین ہی پیش کرنا نہیں ہے، بلکہ آئندہ تجدید دین کے لیے ان کے کاموں سے سبق حاصل کرنا بھی ہے، تو ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ تاریخ پر تنقیدی نگاہ ڈالیں اور ان بزرگوں کے کارناموں کا سراغ لگانے کے ساتھ اُن اسباب کا کھوج بھی لگائیں جنکی وجہ سے یہ اپنے مقصد کو پہنچنے میں ناکام ہوئے۔ شاہ صاحب اور ان کے صاحبزادوں نے علمائے حق اور صالحین کی جو عظیم القدر جماعت پیدا کی، اور پھر سید صاحب اور شاہ شہید نے عملی زہد و اتقیاء کا جو لشکر فراہم کیا، اُسکے حالات پڑھ کر ہم دنگ رہ جاتے ہیں، ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قرن اول کے صحابہ و تابعین کی سیرتیں پڑھ رہے ہیں، اور ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ہم سے اس قدر قریب زمانہ میں اس پایہ کے لوگ ہو گذرے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ہمارے دل میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اتنی زبردست اصلاحی و انقلابی تحریک، جسکے لیڈر اور کارکن ایسے صالح و متقی اور ایسے سرگرم مجاہد لوگ تھے، انتہائی ممکن سعی و عمل کے باوجود ہندوستان پر اسلامی حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوئی، اور اسکے برعکس کئی ہزار میل سے آئے ہوئے انگریز یہاں خالص جاہلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے؟ اس سوال کو عقیدتمندی کے جوش میں لاجواب چھوڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ لوگ صلاح و تقویٰ اور جہاد کو اس دنیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی اصلاح کے معاملہ میں ضعیف الاثر سمجھنے لگیں اور یہ خیال کر کے مایوس ہو جائیں کہ جب ایسے زبردست متقیانہ جہاد سے بھی کچھ نہ بنا تو آئندہ کیا بن سکیگا۔ میں اس قسم کے شبہات فی الواقع لوگوں کی زبان سے سن چکا ہوں، بلکہ حال میں جب مجھے علی گڈھ جانے کا اتفاق ہوا تھا تو اسٹریچی ہال کے بھرے جلسہ میں میرے سامنے یہی شبہ پیش کیا گیا تھا اور اسے رفع کرنے کے لیے مجھے ایک مختصر تقریر کرنی پڑی تھی۔ نیز مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت علمار صالحین کی جو جماعت ہمارے درمیان موجود ہے وہ بالعموم اس مسئلہ میں بالکل خالی الذہن ہے، حالانکہ اگر اس کی تحقیق کی جائے تو بہت سے ایسے سبق ہمیں مل سکتے ہیں جن سے استفادہ کر کے آئندہ زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح کام ہو سکتا ہے۔

پہلا سبب | پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانی کے وقت سے شاہ صاحب اور انکے خلفار تک کے تجدیدی کام میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور ان کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ حاشا کہ مجھے فی نفسہٖ اُس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو ان حضرات نے پیش کیا۔ وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصلی تصوف ہے، اور اسکی نوعیت "احسان" سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوفانہ رموز و اشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال، اور متصوفانہ طریقہ سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کو جاری رکھنا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حقیقی اسلامی تصوف اِس خاص قالب کا محتاج نہیں ہے۔ اسکے سوا اُس کے لیے دوسرا قالب بھی ممکن ہے۔ اُسکے لیے زبان بھی دوسری اختیار کی جا سکتی ہے، رموز و اشارات سے بھی اجتناب کیا جا سکتا ہے، اور پیری مریدی اور اِس سلسلہ کی تمام عملی شکلوں کو بھی چھوڑ کر دوسری شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ پھر کیا ضرور ہے کہ اسی قالب کو اختیار کرنے پر اصرار کیا جائے، حالانکہ یہ پرانا قالب اس بنا پر قابلِ ترک تھا اور ہے کہ مدتہائے دراز سے اِسی قالب میں جاہلی تصوف کی گرم بازاری ہو رہی ہے اور اِس کی کثرتِ اشاعت نے مسلمانوں کو سخت اعتقادی و اخلاقی بیماریوں میں مبتلا کیا ہے، اور اب حال یہ ہو چکا ہے کہ ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شخص خواہ کتنی ہی صحیح تعلیم دے، مگر یہ قالب جہاں استعمال کیا گیا اور پھر وہی تمام بیماریاں عود کر آتی ہیں جو صدیوں کے رواج عام سے اِسکے ساتھ وابستہ ہو گئی ہیں۔ پس جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اُس وقت ممنوع ہو جاتی ہے جبکہ مریض کے لیے نقصان دہ ہو، اُسی طرح یہ قالب بھی مباح ہونے کے باوجود اِس بنا پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے کہ اِسی کے لباس میں مسلمانوں کو افیون کا چسکا لگایا گیا ہے اور اس کے قریب جاتے ہی اِن مزمن مریضوں کو پھر وہی چنیا بیگم یاد آجاتی ہیں جو صدیوں اِن کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی ہیں۔ بیعت کا معاملہ پیش آنے کے بعد کچھ دیر نہیں لگتی کہ مریدوں میں وہ ذہنیت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے جو مریدی کے ساتھ مختص ہو چکی ہے یعنی وہی "بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید" والی ذہنیت جسکے بعد پیر صاحب اور اربابٌ من دون اللہ میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ فکر و نظر مفلوج، قوتِ تنقید ماؤف، علم و عقل کا استعمال موقوف، اور دل و دماغ پر بندگیٔ شیخ کا ایسا مکمل تسلط کہ گویا شیخ ان کا رب ہے اور یہ اسکے مربوب۔ پھر جہاں کشف و الہام کی بات چیت شروع ہوئی اور معتقدین کی ذہنی غلامی کے بند اور زیادہ مضبوط ہونے شروع ہو گئے۔ اسکے بعد صوفیانہ رموز و اشارات کی باری آتی ہے جس سے مریدوں کی قوت واہمہ کو گویا تازیانہ لگ جاتا ہے اور وہ انہیں لے کر ایسی اڑتی ہے کہ بیچارے ہر وقت عجائبات و طلسمات ہی کے عالم میں سیر کرتے رہتے ہیں، واقعات کی دنیا میں ٹھیرنے کا موقع غریبوں کو کم ملتا ہے۔

مسلمانوں کے اِس مرض سے نہ حضرت مجدد صاحب ناواقف تھے، نہ شاہ صاحب۔ دونوں کے کلام میں اس پر تنقید موجود ہے۔ مگر غالباً اِس مرض کی شدت کا انہیں پورا اندازہ نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے ان بیماروں کو پھر وہی غذا دے دی جو اس مرض میں مہلک ثابت ہو چکی تھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دونوں کا حلقہ پھر اسی پرانے مرض سے متأثر ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ مولانا اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر ٹھیک وہی روش اختیار کی تھی جو ابنِ تیمیہ کی تھی لیکن شاہ صاحب کے لٹریچر میں تو یہ سامان موجود ہی تھا اور پیری مریدی کا سلسلہ بھی سید صاحب کی تحریک میں چل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہا تھا، اسلیے مرضِ صوفیت کے جراثیم سے یہ تحریک پاک نہ رہ سکی، حتیٰ کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد ہی ایک گروہ انکے حلقہ میں ایسا پیدا ہو گیا جو شیعوں کی طرح انکی غیبوبت کا قائل ہوا اور اب تک اُن کے ظہورِ ثانی کا منتظر ہے۔ اب جس کسی کو تجدید دین کے لیے کوئی کام کرنا ہو اُسکے لیے لازم ہے کہ متصوفین کی زبان و اصطلاحات رموز و اشارات، لباس، اطوار، پیری مریدی اور ہر اُس چیز سے جو اس طریقہ کی یاد تازہ کرنے والی ہو، مسلمانوں کو اس طرح پرہیز کرائے جیسے ذیابیطس کے مریض کو شکر سے پرہیز کرایا جاتا ہے۔

دوسرا سبب دوسری چیز جو مجھے تنقیدی مطالعہ کے دوران میں محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ سید صاحب اور شاہ شہید نے جس علاقہ میں جا کر جہاد کیا اور جہاں اسلامی حکومت قائم کی، اُس علاقہ کو اِس انقلاب کے لیے پہلے اچھی طرح تیار نہیں کیا تھا۔ اُن کا لشکر تو یقیناً بہترین اخلاقی و روحانی تربیت پائے ہوئے لوگوں پر مشتمل تھا، مگر یہ لوگ ہندوستان کے مختلف گوشوں سے جمع ہوئے تھے اور شمالی مغربی ہندوستان میں انکی حیثیت مہاجرین کی سی تھی۔ اس علاقہ میں سیاسی انقلاب برپا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ خود اس علاقہ ہی کی آبادی میں پہلے اخلاقی و ذہنی انقلاب برپا کر دیا جاتا، تاکہ مقامی لوگ اسلامی نظام حکومت کو سمجھنے اور اُسکے انصار بننے کے قابل ہو جاتے۔ دونوں لیڈر غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ سرحد کے لوگ چونکہ مسلمان ہیں، اور غیر مسلم اقتدار کے ستائے ہوئے بھی ہیں، اسلیے وہ اسلامی حکومت کا خیر مقدم کرینگے۔ اسی وجہ سے انہوں نے جاتے ہی وہاں جہاد شروع کر دیا، اور جتنا ملک قابو میں آیا اُس پر اسلامی خلافت قائم کر دی۔ لیکن بالآخر تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ نام کے مسلمانوں کو اصلی مسلمان سمجھنا اور ان سے وہ توقعات وابستہ کرنا جو اصلی مسلمان ہی پوری کر سکتے ہیں، محض ایک دھوکا تھا۔ وہ لوگ خلافت کا بوجھ سہارنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ جب ان پر یہ بوجھ رکھا گیا تو خود بھی گرے اور اس پاکیزہ عمارت کو بھی لے گرے۔۔۔ تاریخ کا یہ سبق بھی ایسا ہے جسے آئندہ ہر تجدیدی تحریک میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جس سیاسی انقلاب کی جڑیں اجتماعی ذہنیت، اخلاق اور تمدن میں گہری جمی ہوئی نہ ہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ نقش بر آب کی طرح ہوتا ہے۔ کسی عارضی طاقت سے ایسا انقلاب واقع ہو بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکتا، اور جب مٹتا ہے تو اس طرح مٹتا ہے کہ اپنا کوئی اثر چھوڑ کر نہیں جاتا۔

تیسرا سبب | اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس تجدیدی تحریک کے مقابلہ میں کئی ہزار میل دور سے آئے ہوئے انگریزوں کو کس قسم کی فوقیت حاصل تھی جسکی وجہ سے وہ تو یہاں جاہلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ خود اپنے گھر میں اسلامی حکومت قائم نہ کر سکی؟ اس کا صحیح جواب آپ نہیں پا سکتے جب تک کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کے یورپ کی تاریخ آپ کے سامنے نہ ہو۔ شاہ صاحب اور انکے خلفاء نے اسلام کی تجدید کے لیے جو کام کیا، اُسکی طاقت کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیے اور دوسرے پلڑے میں اُس طاقت کو رکھیے جسکے ساتھ انکی ہم عصر جاہلیت اٹھی تھی، تب آپ کو پورا اندازہ ہوگا کہ اس عالم اسباب میں جو قوانین کارفرما ہیں اُن کے لحاظ سے دونوں طاقتوں میں کیا تناسب تھا۔ میں مبالغہ نہ کرونگا اگر یہ کہوں کہ ان دونوں قوتوں میں ایک تولے اور پچاس من کی نسبت تھی اسلیئے نتیجہ جو فی الواقع رونما ہوا اُسکے سوا اور کچھ ہو نہ سکتا تھا۔ جس دور میں ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسمٰعیل شہید پیدا ہوئے، اسی دور میں یورپ قرونِ وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور وہاں ہر علم و فن کے محققین، مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے جنہوں نے ایک دنیا کی دنیا بدل ڈالی۔ وہی دور تھا جس میں ہیوم، کانٹ، فشتے (Fichte)، ہیگل، کونت (Comte)، شلائر ماشر (Schliermacher) اور مِل جیسے فلاسفہ پیدا ہوئے جنہوں نے منطق و فلسفہ، اخلاقیات و نفسیات اور تمام علوم عقلیہ میں انقلاب برپا کیا۔ وہی دور تھا جب طبیعات میں گیلوینی (Galvani) اور وولٹا (Volta)، علم الکیمیا میں لاوو ئیزیئے (Lavoisier) پریسٹلے (Priestlay)، ڈیوی (Davy)، ہائیوی (Haüy)، اور برزلیس (Berzelius)، احیاتیات میں لینے (Linne)، ہالر (Haller)، بیشات (Bichat)، اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وولف (Wolff) جیسے محققین اٹھے جنکی تحقیقات نے صرف سائنس ہی کو ترقی نہیں دی بلکہ کائنات اور انسان کے متعلق بھی ایک نیا نظریہ پیدا کر دیا۔ اسی دور میں کویسنے (Quesnay)، ٹرگوٹ (Turgot)، آدم سمتھ اور مالتھس کی دماغی کاوشوں سے معاشیات کا نیا علم مرتب ہوا۔ وہی دور تھا جب فرانس میں روسو، والٹیر، مونٹسکیو، ڈینس ڈائڈیرو (Denis Diderot)، لامیسٹری (La Mettrie)، کیبانیس (Cabanis)، بفون (Buffon)، روبینے (Robinat)، انگلستان میں ٹامس پین (Paine)، ولیم گوڈون (Godwin)، ڈیوڈ ہارٹلے، جوزف پریسٹلے، ارسمس ڈارون، اور جرمنی میں گوئٹے، ہرڈر، شیلر، ونکلمان (Winckelmann)، لسنگ (Lessing)، اور بیرن دی ہولباش (Baron d'Holbach) جیسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اخلاقیات، ادب، قانون، مذہب، سیاسیات اور تمام علوم عمران پر زبردست اثر ڈالا اور انتہائی جرأت و بے باکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کرکے نظریات و افکار کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی۔ پریس کے استعمال، اشاعت کی کثرت، اسالیبِ بیان کی ندرت، اور مشکل اصطلاحی زبان کے بجائے عام فہم زبان کو ذریعہ اظہار خیال بنانے کی وجہ سے اِن لوگوں کے خیالات نہایت وسیع پیمانے پر پھیلے۔ انہوں نے محدود افراد کو نہیں بلکہ قوموں کو بحیثیت مجموعی متاثر کیا۔ ذہنیتیں بدل دیں، اخلاق بدل دیئے، نظامِ تعلیم بدل دیا، نظریۂ حیات اور مقصد زندگی بدل دیا، اور تمدن و سیاست کا پورا نظام بدل ڈالا۔ اسی زمانہ میں انقلاب فرانس رونما ہوا جس سے ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی۔ اسی زمانہ میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا جس نے ایک نیا تمدن، نئی طاقت اور نئے مسائلِ زندگی کے ساتھ پیدا کیا۔ اسی زمانہ میں انجینیرنگ کو غیر معمولی ترقی ہوئی جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں کہ پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ ہوئی تھیں۔ اسی زمانہ میں قدیم فن جنگ کی جگہ نیا فنِ جنگ، نئے آلات اور نئی تدابیر کے ساتھ پیدا ہوا۔ باقاعدہ ڈرل کے ذریعہ سے فوجوں کو منظم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جس کی وجہ سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میدان جنگ میں پلٹنیں مشین کی طرح حرکت کرنے لگیں اور پرانے طرز کی فوجوں کا ان کے مقابلہ میں ٹھیرنا مشکل ہوگیا۔ فوجوں کی ترتیب، عساکر کی تقسیم اور جنگی چالوں میں بھی پیہم تغیرات ہوئے، اور ہر جنگ کے تجربات سے فائدہ اٹھاکر اس فن کو برابر ترقی دی جاتی رہی۔ آلات حرب میں بھی مسلسل نئی ایجادیں ہوتی چلی گئیں رائفل ایجاد ہوئی، ہلکی اور سریع الحرکت میدانی توپیں بنائی گئیں، قلعہ شکن توپیں پہلے سے بہت زیادہ طاقتور تیار کی گئیں، اور کارتوس کی ایجاد نے نئی بندوقوں کے مقابلہ میں پرانی توڑے دار بندوقوں کو بیکار کرکے رکھ دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یورپ میں ترکوں کو اور ہندوستان میں دیسی ریاستوں کو جدید طرز کی فوجوں کے مقابلہ میں مسلسل شکستیں اٹھانی پڑیں، اور نپولین نے مٹھی بھر فوج سے مصر پر قبضہ کرلیا۔

معاصر تاریخ کے اس سرسری خاکے پر نظر ڈالنے سے بآسانی یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہاں تو چند خاص اشخاص ہی بیدار ہوئے تھے مگر وہاں قوموں کی قومیں جاگ پڑیں۔ یہاں صرف ایک جہت میں تھوڑا سا کام ہوا تھا، اور وہاں ہر جہت میں ہزاروں گنا زیادہ کام کرڈالا گیا بلکہ کوئی شعبۂ زندگی ایسا نہ تھا جس میں تیز رفتار پیش قدمی نہ کی گئی ہو۔ یہاں شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کی اولاد نے چند کتابیں خاص خاص علوم پر لکھیں جو ایک نہایت محدود حلقے تک پہنچ کر رہ گئیں، اور وہاں لائبریریاں کی لائبریریاں ہر علم و فن پر تیار ہوئیں جو تمام دنیا پر چھاگئیں اور آخرکار دماغوں اور ذہنیتوں پر قابض ہوگئیں۔ یہاں فلسفہ، اخلاقیات، اجتماعیات، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ علوم پر طرح نو کی بات چیت محض ابتدائی اور سرسری حد تک رہی جس پر آگے کچھ کام نہ ہوا، اور وہاں اس دوران میں ان مسائل پر پورے پورے نظام فکر مرتب ہوگئے جنہوں نے دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ یہاں علوم طبیعیہ اور قوائے مادیہ کا علم وہی رہا جو پانچ سو سال پہلے تھا، اور وہاں اس میدان میں اتنی ترقی ہوئی اور اس ترقی کی بدولت اہلِ مغرب کی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ ان کے مقابلہ میں پرانے آلات و وسائل کے زور سے کامیاب ہونا قطعی محال تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیرت تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ میں انگریز بنگال پر چھا گئے تھے اور الٰہ آباد تک اِنکا اقتدار پہنچ چکا تھا، مگر اُنہوں نے اِس نئی اُبھرنے والی طاقت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں تو دہلی کا بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہو چکا تھا اور قریب قریب سارے ہی ہندوستان پر انگریزوں کے پنجے جم چکے تھے مگر اُنکے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ آخر کیا چیز اِس قوم کو اس طرح بڑھا رہی ہے اور اس نئی طاقت کے پیچھے اسبابِ طاقت کیا ہیں۔ سید صاحب اور شاہ اسماعیل شہید عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے اٹھے تھے۔ انہوں نے سارے انتظامات تو کیے مگر اتنا نہ کیا کہ اہل نظر علماء کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور یہ تحقیق کراتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھاتی چلی جا رہی ہے، اور نئے آلات نئے وسائل، نئے طریقوں اور نئے علوم و فنون سے کام لے رہی ہے، اِس کی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا راز کیا ہے، اِس کے گھر میں کس نوعیت کے ادارات قائم ہیں، اس کے علوم کس قسم کے ہیں، اس کے تمدن کی اساس کن چیزوں پر ہے، اور اسکے مقابلہ میں ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس وقت یہ حضرات جہاد کے لیے اٹھے ہیں، اُس وقت یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی کہ ہندوستان میں اصلی طاقت سکھوں کی نہیں، انگریز کی ہے، اور اسلامی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی مخالف طاقت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو انگریز ہی کی ہو سکتی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان بزرگوں کی نگاہ دوررس سے معاملہ کا یہ پہلو بالکل ہی اوجھل رہ گیا کہ اسلام و جاہلیت کی کشمکش کا آخری فیصلہ کرنے کے لیے جس حریف سے نمٹنا ہوگا اُسکے مقابلہ میں اپنی قوت کا اندازہ کریں، اور اپنی کمزوری کو سمجھ کر اسے دور کرنے کی فکر کریں۔ بہرحال جب ان سے یہ چوک ہوئی تو اِس عالمِ اسباب میں ایسی چُوک کے نتائج سے وہ نہ بچ سکتے تھے۔

مغربی جاہلیت کے مقابلہ میں اسلامی تجدید کی اس تحریک کو جو ناکامی ہوئی اُس سے پہلا سبق تو ہمیں یہ ملتا ہے کہ تجدید دین کے لیے صرف علوم دینیہ کا احیاء اور اتباع شریعت کی روح کو تازہ کر دینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ ایک جامع اور ہمہ گیر اسلامی تحریک کی ضرورت ہے جو تمام علوم و افکار، تمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فنون و صناعات اور تمام شعبہائے زندگی پر اپنا اثر پھیلا دے اور تمام امکانی قوتوں سے اسلام کی خدمت لے۔ اور دوسرا سبق جو اسی سے قریب الماخذ ہے، یہ ہے کہ اب تجدید کا کام نئی اجتہادی قوت کا طالب ہے۔ محض وہ اجتہادی بصیرت جو شاہ ولی اللہ صاحب یا اُن سے پہلے کے مجتہدین و مجددین کے کارناموں میں پائی جاتی ہے، اس وقت کے کام سے عہدہ برا ہونے کے لیے کافی نہیں ہے۔ جاہلیتِ جدیدہ بے شمار نئے وسائل کے ساتھ آئی ہے اور اس نے بے حساب نئے مسائلِ زندگی پیدا کر دیے ہیں جن کا وہم تک شاہ صاحب اور دوسرے قدماء کے ذہن میں نہ گزرا تھا۔ صرف اللہ جل جلالہ کے علم اور اس کی بخشش سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت ہی پر یہ حالات روشن تھے، لہٰذا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی وہ تنہا ماخذ ہے جس سے اس دور میں تجدید ملت کا کام کرنے کے لیے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور اس رہنمائی کو اخذ کر کے اس وقت کے حالات میں شاہراہِ عمل تعمیر کرنے کے لیے ایسی مستقل قوتِ اجتہادیہ درکار ہے جو مجتہدین سلف میں سے کسی ایک کے علوم اور منہاج کی پابند نہ ہو، اگرچہ استفادہ ہر ایک سے کرے اور پرہیز کسی سے بھی نہ کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نیا نظامِ تعلیم

[یہ وہ خطبہ ہے جو ۵ جنوری ۱۹۴۱ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کی انجمن اتحاد طلبہ کے سامنے مدیر "ترجمان القرآن" نے عرض کیا]

حضرات! خوش قسمتی سے آج مجھے اُس جگہ اپنے خیالات کے اظہار کا موقع مل رہا ہے جہاں موجودہ دور میں سب سے پہلے اسلامی نظام تعلیم کی اصلاح کا تخیل پیدا ہوا، اور سب سے پہلا قدم اسکی طرف اٹھایا گیا۔ اسی وجہ سے میں نے اس موقع کے لیے تعلیمی اصلاح ہی کے سوال کو اپنا موضوع بحث منتخب کیا ہے۔

میرے اس انتخاب میں ایک بڑا محرک یہ بھی ہے کہ اس وقت ہماری دینی درسگاہوں میں عموماً اصلاح تعلیم کے مسئلے پر گفتگو چھڑی ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضرورت کا احساس تو پیدا ہو گیا ہے، مگر جس انداز سے یہ ساری گفتگو ہو رہی ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ اصلاح کی خواہش کرنے والوں کے ذہن میں مسئلہ کی نوعیت کا کوئی واضح تصور نہیں ہے۔ لوگ اس گمان میں ہیں کہ پرانی تعلیم میں خرابی صرف اتنی ہی ہے کہ نصاب بہت پرانا ہو گیا ہے اور اس میں بعض علوم کا عنصر بعض علوم سے کم یا زیادہ ہے اور جدید زمانہ کے بعض ضروری علوم اس میں شامل نہیں ہیں۔ اسلیے اصلاح کی ساری بحث صرف اس حد تک محدود رہ جاتی ہے کہ کچھ کتابوں کو نصاب سے خارج کر کے کچھ دوسری کتابوں کو داخل کر دیا جائے، عناصر تعلیمی کے تناسب میں ترمیم کر کے بعض اجزاء گھٹائے اور بعض بڑھائے جائیں، اور قدیم علوم کے ساتھ تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ علوم کی بھی کچھ کتابیں طلبہ کو پڑھائی جائیں۔ ایسی ہی کچھ جزوی ترمیمات طرز تعلیم اور انتظام مدارس میں بھی تجویز کی جاتی ہیں۔ اور بہت زیادہ "روشن خیالی"

© rasailojaraid.com